

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عالمی قوانین کے کمیشن کا سوالنامہ اور اس کا جواب

[ذیل میں وہ سوال نامہ موجود ہے نقل کیا جا رہا ہے جو حکومت کے مقرر کردہ کمیشن برائے قوانین عالمک طرف سے وصول ہوا ہے۔ اس مرتبہ اشارت کو ملحوظ کر کے یہ مضمون ان صفحات میں اس لیے درج کیا جا رہا ہے کہ اس کے جواب کی مہلت ۱۵ جنوری تک ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ جو لوگ بھی اس سوالنامے کا جواب دینے والے ہوں وہ اس جواب سے فائدہ اٹھا سکیں]

نکاح

سوال کیا نکاح خوانی کا کام صرف حکومت کے مقرر کردہ نکاح خوانوں کے ذریعے ہونا چاہیے؟

جواب جی نہیں۔ اسلامی معاشرے میں کسی قسم کی کھانت (PRIESTHOOD) کے لیے جگہ نہیں ہے۔ ہر مسلمان جس طرح نماز پڑھا سکتا ہے اسی طرح نکاح بھی پڑھا سکتا ہے۔ بلکہ زوجین خود بھی دو گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول کر سکتے ہیں۔ نکاح خواں کا ایک نیا عہدہ از نئے قانون اگر مقرر کر دیا جائے تو لامحالہ دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کرنی پڑے گی۔ یا تو ہر اس نکاح کو باطل قرار دیا جائے جو سرکاری پادری کے بغیر کر لیا گیا ہو۔ یا پھر اسے جائز تسلیم کیا جائے۔ پہلی صورت میں شریعت اور قانون کے درمیان تضاد واقع ہو جائے گا، کیونکہ شریعت کا وہ نکاح صحیح ہو گا۔ اور دوسری صورت میں یہ قاعدہ مقرر کرنا فضول ہو گا۔

سوال کیا نکاحوں کا رجسٹری کرنا لازمی ہونا چاہیے؟ اگر ایسا ہو تو اس کے لیے کیا طریق کار ہونا چاہیے اور

اس کی خلاف ورزی کے لیے کیا اور کسے سزا ہونی چاہیے؟

جواب نکاحوں کو ایک پبلک رجسٹر میں درج کرنے کا انتظام مزید توسیع ہے، مگر اسے لازم نہ ہونا چاہیے۔ شریعت نے نکاح کے لیے جو قواعد مقرر کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نکاح کم از کم دو گواہوں کے سامنے ہو، اور اس کو علی الاطلاق کیا بدلے تاکہ زوجین کے رشتہ داروں اور ترب کے حلقہ تعارف میں ان کا رشتہ معلوم و معروف ہو جائے۔ نزاعات کی صورت میں اس طریقہ سے نکاح کی صداقت پر بہم پہنچنا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ تاہم قیام شہادت

میں مزید سہولتیں دو طریقوں سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ایک معیاری نکاح نامہ مرتب کر کے عام طور پر شائع کر دیا جائے تاکہ لوگ نکاح سے متعلق تمام ضروری امور اس میں درج کر کے شہادتیں ثبت کر لیا کریں۔ دوسرے یہ کہ ہر محلے اور بستی میں لکھوں کا ایک رجسٹر رکھ دیا جائے تاکہ جو بھی اس میں نکاح کا اندراج کرانا چاہے کر دے۔ لوگ بالعموم خود ہی اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے ان دونوں سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں گے۔ لیکن اسے لازم کرنے میں دو قباحتیں ہیں۔ ایک یہ کہ خلاف ورزی کرنے والوں کو کوئی نہ کوئی سزا دینی ہوگی، اور اس طرح خواہ مخواہ ایک نئے جرم کا اضافہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ غیر رجسٹری شدہ نکاحوں کو تسلیم کرنے سے عدالتوں کو انکار کرنا ہوگا، حالانکہ جو نکاح گواہوں کے سامنے کیا جائے وہ شرعاً منعقد ہو جاتا ہے اور عدالت اُس کے وجود سے انکار کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ پھر یہ بھی غور طلب ہے کہ آیا آپ غیر رجسٹری شدہ نکاحوں سے پیدا ہونے والے بچوں کو ناجائز اولاد قرار دیں گے اور انہیں پوری جائداد کی وراثت سے بھی محروم کریں گے؟ اگر یہاں تک آپ نہیں جانا چاہتے تو رجسٹری کو قانوناً لازم کرنا آخر کیا معنی رکھتا ہے۔

سوال۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ زوجین میں سے ہر ایک نے کسی دباؤ کے بغیر اپنی رضامندی سے ایجاب قبول کیا ہے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟

جواب۔ قانونی اغراض کے لیے ایجابی طور پر یہ معلوم ہونا ضروری نہیں ہے کہ نکاح کے فریقین نے اپنی رضامندی سے نکاح کیا ہے۔ جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ کسی فریق نے دباؤ کے تحت بلا رضا و رغبت مجبوراً ایجاب قبول کیا ہے اُس وقت تک ہر نکاح کے متعلق یہی فرض کیا جائے گا کہ وہ برضا و رغبت ہوا ہے۔ اسلام میں ایجاب قبول لازماً دو گواہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ بالغ لڑکے کا نکاح اُس وقت تک صحیح نہیں ہوتا جب تک وہ گواہوں کے سامنے بالفاظ صریح اسے قبول نہ کرے۔ لڑکی کے لیے (اگر وہ باکرہ ہو) زبانی اقرار ضروری نہیں ہے، لیکن اگر وہ باوازیہ بندھے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسے نکاح منظور نہیں۔ اس طرح شریعت نے خود رضامندی متحقق کرنے کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے، اور یہ بالکل کافی ہے۔ پس پردہ اگر لڑکے یا لڑکی پر کوئی دباؤ ڈالا گیا ہو تو اس کا ثبوت مدعی کو لانا چاہیے۔ تاہم ایسے کسی دباؤ کے عدم کے لیے ثبوت کا مطالب نہیں ہے، بلکہ اس کے وجود کا ثبوت مانگنا ہے اگر کوئی اُس کا دعویٰ کرے۔ دباؤ کے عدم کا ثبوت لازم کر دینے سے نہ صرف یہ کہ قانون کا منشا اٹھ جائے گا بلکہ اس سے عملاً سخت مشکلات رونما ہوں گی

سوال۔ کیا آپ کے نزدیک کسی کی شادیوں کو روکنے کے لیے یہ قانون بنانا ضروری ہے کہ شادی کے وقت مرد کی عمر ۱۸ سال سے کم اور عورت کی ۱۵ سال سے کم نہ ہو۔

جواب۔ کم سنی کی شادیاں روکنے کے لیے کسی قانون کی حاجت نہیں اور اس کے لیے ۱۸ سال اور ۱۵ سال کی عمر مقرر کر دینا بالکل غلط ہے۔ ہمارے ملک میں ۱۸ سال کی عمر سے بہت پہلے ایک لڑکا جسمانی طور پر بالغ ہو جاتا ہے، اور لڑکیاں بھی ۱۵ سال سے پہلے جسمانی بلوغ کو پہنچ جاتی ہیں۔ ان عمروں کو از روئے قانون نکاح کی کم سے کم عمر قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اس سے کم عمر والے لڑکوں اور لڑکیوں کی صرف شادی پر اعتراض ہے کسی دوسرے طریقے سے جنسی تعلقات پیدا کر لینے پر کوئی اعتراض نہیں۔ شریعت اسلام نے اس طرح کی مصنوعی حد بندیوں سے اسی لیے احتراز کیا ہے کہ یہ حقیقت بالکل غیر معقول ہیں۔ اس کے بجائے یہ بات لوگوں کے اپنے ہی اختیار و تمیزی پر چھوڑ دینی چاہیے کہ وہ کب نکاح کریں اور کب نہ کریں۔ لوگوں میں تعلیم اور عقلی نشوونما کے ذریعہ سے جتنا زیادہ شعور پیدا ہوگا اسی قدر زیادہ صحیح طریقہ سے وہ اپنے اس اختیار و تمیزی کو استعمال کریں گے، اور کم سنی کے نامناسب نکاحوں کا وقوع، جو اب بھی ہمارے معاشرے میں کچھ بہت زیادہ نہیں ہے، روز بروز کم تر ہوتا چلا جائیگا۔ شرعاً ایسے نکاحوں کو جائز صرف اس لیے رکھا گیا ہے کہ بسا اوقات کسی نامزدان کی حقیقی مصلحتیں اس کی متقاضی ہوتی ہیں۔ اس ضرورت کی خاطر قانوناً اسے جائز ہی رہنا چاہیے، اور اس کے نامناسب رواج کی روک تھام کے لیے قانون کے بجائے تعلیم اور عام بیداری کے وسائل پر اعتماد کرنا چاہیے۔ معاشرے کی ہر خرابی کا علاج قانون کا ٹھہ ہی نہیں ہے۔

سوال۔ کیا آپ کے نزدیک نکاح کے لیے عمروں کا یہ تعین از روئے قرآن کریم یا از روئے حدیث صحیح منسوخ ہے؟

جواب۔ نکاح کے لیے عمروں کے تعین کی کوئی صریح ممانعت تو قرآن و حدیث میں نہیں ہے، مگر کم سنی کے نکاح کا جواز سنت سے ثابت ہے اور احادیث صحیحہ میں اس کے عملی نظر موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو چیز شرعاً جائز ہے اس کو آپ قانوناً حرام کس دلیل سے کرتے ہیں؟ آپ کا ایک عمر از روئے قانون مقرر کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس عمر سے کم میں اگر کوئی نکاح کیا جائے تو آپ اسے باطل قرار دینگے اور ملکی عدالتیں اس کو

تسلیم نہ کریں گی کیا اسے ناجائز اور باطل ٹھیرانے کے لیے کوئی اجازت قرآن یا حدیث صحیح میں موجود ہے؛ دراصل یہ طرز سوال بہت ہی مغالطہ آمیز ہے تعین عمر صرف ایک ایجابی پہلو ہی نہیں رکھتی بلکہ ساتھ ساتھ ایک سلبی پہلو بھی رکھتی ہے۔ اس کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ آپ نکاح کے لیے محض ایک عمر مقرر کرنا چاہتے ہیں، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس عمر سے پہلے نکاح کرنے کو آپ حرام بھی کرنا چاہتے ہیں اس منفی پہلو کو نظر انداز کر کے صرف یہ پوچھنا کہ کیا اس کا مثبت پہلو ممنوع ہے، سوال کو ادھوری شکل میں پیش کرنا ہے۔ سوال کی تکمیل اس وقت ہوگی جب آپ ساتھ ساتھ یہ بھی پوچھیں کہ کیا ایک عمر خاص سے پہلے نکاح کو ناجائز ٹھیرانے کے حق میں کوئی دلیل قرآن یا کسی حدیث صحیح میں ملتی ہے؟

سوال۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ معاہدہ ازدواج میں ہر ایسی شرط و وجہ ہو سکتی ہے جو اسلام اور اخلاق کے بنیادی اصولوں کے خلاف نہ ہو اور عدالت اس کے ایفاء پر مجبور کرے؟

جواب۔ اس سوال کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ یہ ہے کہ کیا ایسی شرطیں معاہدہ ازدواج میں درج ہو سکتی ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتی ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایسی کچھ شرائط اندوئے قانون معاہدہ نکاح کا لازمی جز بنادی جائیں اور حکومت کی طرف سے شائع کردہ معیاری نکاح نامے میں ان کو شامل کر دیا جائے شریعت نے اس معاملے کو ہر انفرادی نکاح کے فریقین پر چھوڑا ہے اور انہیں اختیار دیا ہے کہ جو مباح شرطیں بھی وہ چاہیں آپس میں طے کر لیں۔ اس حد سے تجاوز کر کے بعض شرطوں کو قانون یا رواج کی حیثیت دے دینا اصول کے بھی خلاف ہے اور عملاً بھی اس سے بہت سی خرابیاں رونما ہو سکتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں جو بات تجربے سے ثابت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ بالعموم کامیاب ازدواجی رشتے وہی ہوتے ہیں جن میں فریقین نے باہمی اعتماد پر معاملہ کیا ہو اور طرح طرح کی شرطوں سے ایک دوسرے کو باندھنے کی کوشش نہ کی ہو۔ شرطوں کی بندشیں عام طور پر لاشی خرابی پیدا کرتی ہیں۔ کیونکہ ان کی بدولت رشتے کا آغاز ہی بے اعتمادی سے ہوتا ہے۔ مصنوعی شرطوں کو رائج کرنے کے لیے صرف یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ اسلام اور اصول اخلاق کے خلاف نہیں ہیں۔ کیسی چیز کے خلاف اسلام اور خلاف اخلاق نہ ہونے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اسے منور کرنا چاہیے۔

سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ کیا عدالتیں ایسی شرطوں کے ایفاء پر حکماً مجبور کر سکتی ہیں جو معاہدہ ازدواج میں

صحیح ہوں اور خلاف اسلام و اخلاق نہ ہوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت کی مقرر کردہ شرطوں کے سوا جتنی شرطیں بھی معاہدہ ازدواج میں درج کی گئی ہوں انہیں نافذ کرتے وقت عدالت کو صرف یہی نہیں دیکھنا چاہیے کہ وہ خلاف اسلام و اخلاق نہیں ہیں، بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ طرفین کے انفرادی حالات میں وہ معقول اور منصفانہ بھی ہیں۔

سوال۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ اندوئے قانون یہ صحیح تسلیم کیا جائے کہ معاہدہ ازدواج میں یہ

شرط مدع ہو سکتی ہے کہ عورت کو بھی اعلان طلاق کا وہی حق حاصل ہو گا جو مرد کو حاصل ہے؟

جواب۔ اگر ایجاب و قبول کے وقت عورت یہ کہے کہ میں اپنے آپ کو تیرے نکاح میں پس شرط کے ساتھ دیتی ہوں کہ میں جب چاہوں اپنے اوپر طلاق وارڈ کرنے کی مختار ہوں گی، اور مرد اسے قبول کرے تو قانوناً اس شرط کو صحیح تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ صورت تفویض طلاق کی ہے اور فقہان نے اسے جائز رکھا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تفویض طلاق کا قانوناً جائز ہونا اور چیز ہے اور اسلامی معاشرے میں اسے رواج دینے کی کوشش کرنا اور چیز۔ اس کا قانونی جواز تو صرف اس بنا پر ہے کہ مرد کو شریعت نے طلاق کا جو اختیار دیا ہے اسے وہ اپنی طرف سے نیابتاً یا وکالتاً جسے چاہے سوچ سکتا ہے اور عورت کو بھی وہ تفویض کر سکتا ہے۔ لیکن اس کی ترویج اور ہر معاہدہ نکاح میں اس شرط کو شامل کرنے کی کوشش قطعاً اسلام کے منشاء کے خلاف ہے اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان حقوق و اختیارات کا جو تناسب قائم کیا ہے اس کا یہ فطری اور منطقی تقاضا ہے کہ زوجین میں سے صرف مرد ہی طلاق کا مختار ہو۔ اُس نے ہر اور زمانہ عدت کا نفقہ اور چھوٹے بچوں کے زمانہ رضاعت و حضانت کا خرچ کھیتہ مرد پر ڈالا ہے، اس لیے مرد مجبور ہے کہ طلاق کا اختیار استعمال کرنے میں احتیاط سے کام لے، کیونکہ اس کا پورا مالی نقصان اسی کو برواشت کرنا ہو گا۔ بخلاف اس کے عورت پر کوئی مالی ذمہ داری اس نے عائد نہیں کی ہے بلکہ طلاق کے نتیجے میں اسے کچھ لینا ہی ہوتا ہے، دنیا کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اختیار طلاق کے استعمال میں سخت بے احتیاطی کر سکتی ہے، بلکہ ذرا سے اشتعال پر بھی بے تکلف طلاق دے سکتی ہے۔ ان وجوہ سے عورت کی طرف اس اختیار کو منتقل کر دینا اس اسکیم کے بالکل خلاف ہے جو اسلام نے اپنے ازدواجی قانون میں پیش نظر رکھی ہے۔ اس غلط طریقے کو اگر رائج کیا گیا تو معاشرے میں اس کے بہت بُرے نتائج رونما ہونگے اور ہم کثرت طلاق کی ایک ایسی وبا سے دوچار ہو جائیں گے جس سے اس تک ہمارا معاشرہ محفوظ رہا ہے۔